ابوالکلام کے ترجمہ قرآن کا اسلوبِ تجزیہ

سمیع اللہ زبیری ☆

قیس سا پھر نہ اٹھا بنی عامر میں
فخر ہوتا ہے گھرانے کا سدا ایک ہی شخص

قرآن کریم ساری انسانیت کے لیے پیغام ربانی ہے اور آسمانی کتابوں کی آخری کڑی بھی، جو بندوں کا رشتہ معبود حقیقی سے جوڑتی اور سابقہ کتب سے اپنے اٹوٹ تعلق کو لحظہ بھر کے لیے فراموش نہیں کرتی ہے.

ہندوستان کی سندھی زبان میں قرآن مجید کا قدیم ترجمہ ۲۷۰ھ/۸۸۳ میں ایک ہندو راجہ کی فرمائش پر کیا گیا، مترجم ایک مفت زبان عراقی تھا جس کو سندھی اور قرب وجوار کی دوسری زبانوں پر عبور حاصل تھا۔ عجائب الہند میں بزرگ بن شہریار نے اس پورے واقعہ کا ذکر کیا ہے۔

شاہ عبدالقادر دہلوی کے ترجمہ سے دو برس پیشتر بھاشا میں نہایت عمدہ ترجمہ قرآن شریف کا ہوا، جس کا نسخہ مولانا فضل الرحمٰن گنج مرادآبادی نے دیکھا تھا۔ (۱)

شاہ عبدالقادر کا ترجمہ ۱۲۰۵ھ میں تکمیل کو پہنچا، جس کی زبان پرانی ہونے کے باوجود آج تک اپنی تاثیر وخوبی تعبیر میں اپنی مثال آپ ہے۔ شاہ رفیع الدین دہلوی نے خاص فرمائش کے تحت قرآن کا درس لفظ بلفظ ترجمہ کر کے دیا اور درس لینے والے نے اسے بکمال احتیاط قلم بند کر کے شاہ صاحب کو دکھایا اس طرح لفظی ترجمہ کا ایک کامل نمونہ ہاتھ آیا۔ اردو زبان کی مشاطگی جب فورٹ ولیم کالج کے ارباب حل وعقد نے حسب ضرورت شروع کی تو ترجمہ قرآن کا اہتمام بھی کیا گیا، جس کی طباعت واشاعت نہیں ہوسکی، اس کا نسخہ جو غالباً اصل مسودہ ہے، ایشیاء تک سوسائٹی کلکتہ کے ذخیرہ مخطوطات اردو میں محفوظ ہے، انیسویں صدی کے درمیانی عرصہ میں مولوی لطف اللہ بنگالی نے ایک تفسیر اردو میں لکھی تھی۔ یہ نواب صدیق حسن خاں کے سن رسیدہ معاصرین میں تھے۔ ان کا مستقل قیام لکھنؤ میں تھا۔ (۲)

۱۸۷۹ء سرسید احمد خان نے اپنی تفسیر نگاری کا سلسلہ شروع کیا جو ''سورۃ النحل'' سے آگے نہ بڑھ سکا ابتدائی چودہ پاروں کی تفسیر لکھی اور چھاپی جا چکی تھی کہ مصنف کا پیمانہ زندگی لبریز ہو گیا۔ انہوں نے اپنے خاص نظریات کے تحت قرآن کے ترجمہ وتفسیر کی داغ بیل ڈالی جس میں زبان و بیان اور روانی بہ نسبت سابق قابل تعریف حد تک پائی جاتی ہے، لیکن اصل مضمون کے سلسلہ میں توازن برقرار نہیں رہا۔ ڈپٹی نذیر احمد نے سرسید سے عام بدگمانی کے پیش نظر محسوس کیا کہ ضرورت زمانہ کے لحاظ سے ایک شاندار ترجمہ پیش کرنے کی گنجائش باقی ہے، لہذا انہوں نے اپنی قادر الکلامی وتدبر قرآن کا جوہر شاہ عبدالقادر کے ترجمہ کی قدامت کا بہانہ نکال کر دکھایا، چنانچہ ان کا ترجمہ ۱۳۱۴ھ میں طبع ہو کر مخصوص حلقہ میں مقبول بھی ہوا، لیکن تمام تر احتیاط کے باوجود سرسید کے خیالات کی تہ نشین جھلکیاں، معاصر ناقدین کی نگاہوں سے اوجھل نہ رہ سکیں اور وہ قبول عام اس ترجمہ کو حاصل نہ ہو سکا جس کی توقع خود ترجمہ نگار کو تھی۔ نواب صدیق حسن خاں نے جو ہندوستان کے عربی فارسی نگار مصنفین کے زمرہ میں صف اول کے صاحب قلم ہیں اردو میں بھی تفسیر نگاری کا اہتمام کیا۔ ۱۳۰۲ھ/ ۱۸۸۵ء میں انہوں نے تفسیر لکھنا شروع کی، جیسا کہ اس کے تاریخی نام ''ترجمان القرآن بلطائف البیان'' سے ظاہر ہے، انہوں نے اپنے ترجمہ کی بنیاد شاہ عبدالقادر کے ترجمہ پر رکھی اور تفسیر میں اپنی مفصل تفسیر ''فتح البیان'' کے ضروری مضامین کو سلیس اردو کے قالب میں ڈھال دیا۔ سورۃ الحج پارہ نمبر ۱۷ تک یہ تفسیر مطبع صدیقی لاہور سے شائع ہو سکی تھی کہ نواب صاحب کا انتقال ہو گیا اور اس کا تکملہ مولانا ذوالفقار احمد نقوی نے جو نواب صاحب کے خاص تلامذہ میں تھے لکھ کر شائع کیا۔ البتہ آخری دو پاروں کی تفسیر بھی خود نواب صاحب ہی کر کے ۱۳۱۰ھ سے بہت پہلے طبع کرا چکے تھے۔ غرض انیسویں صدی کے اواخر تک متعدد نئے تجربات ترجمانی قرآن وتفسیر نگاری کے میدان میں ہو چکے تھے جن کا اثر مثبت یا منفی بیسویں صدی کے مترجم ومفسر پر ناگزیر تھا کہ مرتب ہو۔

برعظیم کے دور غلامی میں دیکھا جائے تو بڑے بڑے ذی علم، ذہین وذکی اور بیدار دماغ اہل علم پیدا ہوئے۔ مولانا محمد قاسم نانوتویؒ، شیخ الہندؒ، مولانا محمد مظہر نانوتویؒ، حضرت تھانویؒ، علامہ شبلی نعمانیؒ، سید سلیمان ندویؒ، مفتی کفایت اللہؒ، مولانا سید محمد علی مونگیری اور دوسرے علماء عظام اور انہوں نے اپنے اپنے زمانہ میں بڑی اہم علمی، دینی اور تعلیمی خدمات انجام دیں۔

مولانا ابوالکلام آزاد نے بھی اسی دور غلامی میں آنکھ کھولی۔ اللہ تعالی نے آپ کو ذہن رسا اور

دینی بصیرت سے نوازتھا، وہ دین کی خدمت کا جذبہ بے پناہ رکھتے تھے۔

مولانا نے نثری خدمات کی ابتدا ۱۹۰۱ء میں ''المصباح'' جاری کر کے کی، بعد میں ندوہ کی حمایت میں چھوٹے چھوٹے رسائل قلمبند کیے۔ ۱۹۰۲ء میں ''اعلان حق'' کی اشاعت ہوئی، جس کے مطالعہ سے محسوس ہوتا ہے کہ کس قدر سنجیدہ اور تجربہ کار شخص کی تحریر ہے۔

اسی کے ساتھ مولانا آزاد کے مضامین احسن الاخبار، مخزن، تحفہ احمدیہ، اڈورڈ گزٹ اور خدنگ نظر وغیرہ مختلف رسائل میں شائع ہوتے رہے جس کی وجہ سے مولانا پڑھے لکھے حلقے میں قدر کی نگاہ سے دیکھے جانے لگے۔ ماہنامہ ''لسان الصدق'' شائع ہوا تو مولانا کی فکر میں گہرائی اور قلم میں پختگی آ چکی تھی، اب وہ محض لکھنے کے لیے نہیں لکھ رہے تھے، بلکہ حصول مقاصد کے لیے قلم اٹھا رہے تھے۔ اس دور کے مضامین میں انہوں نے نہایت سادہ زبان استعمال کی ہے۔ اس میں آزاد کے مختلف موضوعات سے متعلق مضامین کے ساتھ ساتھ کتابوں پر تبصرے بھی شائع ہوئے ہیں، جو ان کے تنقیدی شعور کی طرف بھی اشارہ کرتے ہیں۔ ان میں ''حیات جاوید'' پر تبصرہ نے بڑی شہرت پائی جس کی وجہ سے اہل نظر کی نگاہیں آزادی کی طرف اٹھنے لگیں۔

آزاد کی وہ تحریریں جو ''الندوہ میں شائع ہوئیں زیادہ گرانقدر ہیں، ان میں وہ علامہ شبلی سے متاثر معلوم ہوتے ہیں۔ یہیں سے ان کی نثری تحریریں عالمانہ انداز اختیار کرنے لگتی ہیں۔ اس زمانے میں مولانا نے دوسرے چھوٹے چھوٹے رسائل بھی قلمبند کیے، لیکن چونکہ وہ وقتی ضرورت سے لکھے گئے تھے اس لیے ان کو کوئی خاص اہمیت نہیں ہے۔

لیکن جب ۱۹۱۲ء میں ''الہلال'' جاری ہوا اور اس میں مولانا کی زیادہ سے زیادہ تحریریں شائع ہونے لگیں تو نثر کی زبان اچانک تبدیل ہو کر ''الہلالی'' بن گئی۔ جس پر عربی فارسی کے اثرات نمایاں ہوتے تھے۔ اس کے باوجود روکھی، پھیکی اور بوجھل نہیں تھی، بلکہ بڑی رواں، دواں، پروقار اور پرشکوہ تھی۔ مولانا کے خطابتی، ادعائی اور انانیتی طرز نگارش نے اس میں ایک خاص کیفیت اور تاثیر پیدا کر دی تھی، اس کی ایک خاص خوبی یہ تھی کہ مولانا قرآن کی آیتوں کو جگہ جگہ اپنی تحریروں میں استعمال کرنے لگے تھے تاکہ اپنی بات کو باوقار انداز سے سمجھا سکیں۔ چنانچہ یہ بات ''الہلال'' کے سلسلہ میں عام طور سے کہی جاتی ہے کہ مولانا آزاد نے پہلی بار قرآن کو روزمرہ زندگی میں استعمال کرنے کا راستہ بتایا اور فیضیاب

ہونے کے سلیقے سے آگاہ کیا، الہلال، البلاغ اور الہلال دور ثانی کی زبان تقریباً ایک جیسی رہی۔ ان رسائل نے اگرچہ گہرے اثرات اپنے دور پر چھوڑے، لیکن ان کی زبان قابل تقلید نہ بن سکی۔ یہ تو کچھ مولانا آزاد اور ان کے ساتھیوں کی کرامت تھی جو الہلال جیسی اردو استعمال کرنے پر قدرت رکھتے تھے اور مولانا آزاد کا فیض تھا کہ انہوں نے صحافت کی عام زبان کو، عالمانہ وقار اور ادبی شان عطا کی، بلاشبہ آج کہا جاسکتا ہے کہ الہلال (دور اول) کو بند ہوئے صدی ہونے کو ہے، لیکن اردو کو اس پایہ کا ہفتہ وار آج تک نصیب نہیں ہوا۔ اس کا ایک اقتباس ملاحظہ کیجیے:

''مجھ کو تمام دنیا کی طرح معلوم ہے صبر و تحمل اور ضبط و حزم بہر حال غیظ و غضب و بے صبری سے بہتر ہے۔ میں جانتا ہوں کہ تسامح و رواداری اور نرمی و لینیت کی انسانی قلوب پر حکومت ہے اور سختی و خشونت انسان کی ملکوتی فضائل کی فہرست میں داخل نہیں۔ میں نے قرآن کریم میں پڑھا ہے کہ جب ایک داعی حریت اور مجاہد فی سبیل الحق کو خدا نے مصر کے شخصی فرمان رواں کے پاس بھیجا تھا تو کہا تھا کہ ''وقولو له قولًا لينا'' میں دنیا کے اس سب سے بڑے شخص کی نسبت بھی سن چکا ہوں جس کو کہا گیا تھا'' **فبما رحمة من الله لنت لهم ولو كنت فظا غليظ القلب لا نفضوا من حولك** ''(۳)

''تذکرہ'' مولانا آزاد کی پہلی مستقل کتاب ہے جو انہوں نے اگرچہ نہایت بے ترتیبی اور بے سکونی کی حالت میں لکھی ہے، لیکن اس کے باوجود وہ اپنے اسلاف کے حالات کو بہتر صورت میں اور اچھے مقصد کے لیے جمع کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ اس کی حیثیت یقیناً خودنوشت سوانح حیات کی نہیں ہوسکتی لیکن جدید تذکروں میں وہ ضرور شمار کی جاسکتی ہے جس کے پس پردہ خود مولانا کے افکار وخیالات و جذبات و احساسات رغبت و نفرت اور ارباب صدق وصفا کے لیے احترام و عقیدت ہے۔

اس کا اسلوب کہیں کہیں خطیبانہ ہے اور پیرانہ بیان دل نشیں لیکن عربیت اور فارسیت کی زیادتی نے کبھی کبھی اور کہیں کہیں اس کی دلکشی اور شیرینی مجروح کردی ہے۔

الہلال کو مولانا آزاد نے دعوت کی حیثیت دی ہے یہ کتاب بھی مولانا کی اسی جذبہ دعوت کو تسکین پہنچاتی ہے اس کے ذریعہ انہوں نے علماء حق کے عظیم کردار، اعمال اور عزائم پیش کر کے ان کی راہ کو اختیار کرنے کی دعوت دی ہے۔

۱۹۱۲ء میں جب مولانا ابوالکلام آزاد نے الہلال جاری کیا تھا تو اسی وقت انہوں نے محسوس

کیا تھا، کہ لوگ قرآن کو اس کی حقیقی شکل اور نوعیت میں جاننا چاہتے ہیں، لیکن انہیں اس وقت کوئی تدبیر نظر نہیں آئی تھی۔

۱۹۱۴ء ۱۹۱۵ء میں ان سے سوال کیا گیا تھا کہ'' قرآن کی تعلیم کے لیے کیا کیا جائے تو وہ اس کا جواب نہیں دے سکے تھے، لیکن اسی وقت سے اس سوال نے انہیں فکر مند کر دیا تھا۔ چنانچہ پہلی بار انہوں'' البلاغ'' کے صفحات پر ترجمہ، تفسیر، مقدمہ تفسیر کا اعلان کیا، مولانا آزاد کا خیال تھا کہ قرآن کی عام تعلیم کے لیے ترجمہ کافی ہوگا۔ مطالعہ کے لیے تفسیر ضرورت پوری کرے گی اور اہل علم ونظر کے لیے مقدمہ مفید ہوگا۔

مگر بار بار نظر بند کیے جانے اور خانہ تلاشی کے مرحلوں، ترجمان القرآن کے مسودوں کی ضبطی اور بربادی کی وجہ سے مولانا آزاد کو اگر چہ نئی آزمائشوں سے گزرنا پڑا، لیکن قرآن فہمی کے لیے ترجمہ اور تفسیر کی جو خواہش تھی وہ کسی حالت میں کم نہیں ہوئی۔ چنانچہ اس کی پہلی جلد ستمبر ۱۹۳۱ء میں وہ شائع کرنے میں کامیاب ہوے۔

یہ اپنی زندگی میں شیخ ابن تیمیہ، ابن القیم اور اس کے دور کے دوسرے علما سے کافی متاثر تھے، اخیر دور کے حضرت شاہ ولی اللہ سے آپ کو بے پناہ محبت وعقیدت تھی، آپ کی تمام کتابوں کا بغور مطالعہ کیا تھا اور آپ نے اہل ملک کو جس طرح جگانے کے لیے آواز دی تھی، مولانا آزاد پر اس کا گہرا اثر تھا۔ ''الہلال'' و''البلاغ'' نکال کر آپ نے بھی قوم وملک کو جھنجھوڑ دیا تھا اور علمائے کرام اور جدید تعلیم یافتہ کے دلوں میں صور پھونک دیا تھا۔ جس سے یہ بیدار ہونے پر مجبور ہو گئے تھے۔

انگریزی حکومت نے اسی پاداش میں آپ کو رانچی میں نظر بند کر دیا تھا۔ اس موقع کو مولانا نے اپنے لیے غنیمت جانا اور ترجمہ قرآن کا جو ارادہ چلا آرہا تھا، اس کو پورا کرنے کا عزم فرمالیا۔ اس سے پہلے اس پر بہت کچھ کام کر چکے تھے۔ یہاں پورا وقت اپنے اسی کام کی تکمیل پر صرف کیا۔ اس سے پہلے تمام تراجم پر نظر ڈال چکے تھے اور عربی وفارسی کی تمام تفسیریں دیکھ چکے تھے، مقصد یہ ہے کہ اس کے لیے پہلے کافی تیاری کی تھی۔ پھر ترجمہ کا کام شروع کیا تھا تا کہ جو لکھا جائے پوری بصیرت اور ذمہ داری سے لکھا جائے خود لکھتے ہیں:

'' کامل ستائیس برس سے قرآن کریم میرے شب وروز کے فکر ونظر کا موضوع رہا ہے۔ اس کی

ایک ایک سورت، ایک ایک مقام، ایک ایک آیت اور ایک لفظ پر میں نے وادیاں قطع کی ہیں اور مرحلوں پر مرحلے طے کئے ہیں، کتب تفاسیر کا جتنا مطبوعہ اور غیر مطبوعہ ذخیرہ موجود ہے، میں کہہ سکتا ہوں کہ اس کا بڑا حصہ میری نظر سے گذر چکا ہے اور علوم قرآن کے مباحث کا کوئی گوشہ نہیں جس کی طرف سے ذہن نے تغافل اور جستجو نے تساہل کیا ہو۔(۴)

پھر ذہن میں یہ بات مرکوز تھی کہ مسلمانوں کی بیداری میں قرآن پاک سے جتنا کام ہوسکتا ہے وہ دوسری کتابوں سے ممکن نہیں۔ ہزار لکھا جائے اور بولا جائے لیکن قرآن پاک میں جو تاثیر قدرت نے دے رکھی ہے وہ کسی کو حاصل نہیں۔ اس طرف بھی ان جملوں میں اشارہ فرمایا:

''میرا یقین ہے کہ مسلمانوں کی زندگی اور ان کی سعادت کے لیے سرچشمہ حیات قرآنی انبعاث ہے اور میں نے کوشش کی ہے کہ اس سے فہم وبصیرت کا دروازہ ان پر کھل جائے''

مولانا مرحوم نے اس ترجمہ کا نقشہ کلکتہ میں تیار کیا تھا، مگر زیادہ توجہ اس وقت ہوئی جب ۱۹۱۶ء میں آپ رانچی تشریف لائے اور قانونی مجبوری کی وجہ سے مسلسل چار سال رہنا پڑا، یعنی ۱۹۱۹ء تک۔

ترجمہ کی زبان ہلکی پھلکی اور رواں دواں رکھی، کہ ہر شخص پڑھ کر آسانی کے ساتھ سمجھ لے۔ الفاظ سے زیادہ معانی پر نگاہ رکھی کہ جو ترجمہ ہوا اسلاف کے ترجمہ کے مطابق ہو اور قرآن کا صحیح مفہوم واضح ہوتا ہو، خود تحریر فرماتے ہیں:

''میں نے یہ مطلب اسی سادہ طریقے پر بیان کر دیا ہے جو قرآن کے بیان وخطاب کا طریقہ ہے''

ترجمہ کر کے اس کا تجربہ کر لیا کرتے تھے کہ اردو پڑھنے والے اس کو روانی سے پڑھ سکیں گے یا نہیں، اس کے ساتھ پڑھ کر سمجھ بھی لیں گے یا نہیں گویا مخاطب کی پوری رعایت پیش نظر تھی۔ 'البلاغ والہلال کا جو طرز تھا ترجمان القرآن کا طرز بالکل اس سے الگ تھا، مولانا نے لکھا ہے:

''میں نے تجربہ کے لیے سورہ بقرہ کا مجرد ترجمہ یک پندرہ برس کے لڑکے کو دیا، جو اردو کی آسان کتابیں آسانی سے پڑھ لیتا تھا۔ پھر ہر موقع پر سوالات کر کے جانچا جہاں تک مطلب سمجھ لینے کا تعلق ہے۔ وہ ایک مقام پر بھی نہیں اٹکا اور تمام سوالوں کا جواب دیتا رہا''

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ترجمہ برائے ترجمہ نہیں ہے، بلکہ منشا یہ ہے کہ عوام وخواص پڑھیں اور سلاست ایسی ہو کہ معمولی اردو خوان بھی پڑھ لے اور عام فہم بھی ایسا ہو کہ غیر معمولی اور عام مسلمان بھی

سمجھ لے، اور کسی کو دقت محسوس نہ ہو۔

''ترجمان القرآن'' پہلی کتاب تھی، جو لوگوں کے ہاتھوں میں پہنچی، یہ واقعہ ہے کہ علوم نواز حلقہ میں اس کی دھوم مچ گئی اور قدیم وجدید سبھوں نے خرید کر پڑھی اور ترجمان القرآن کے بیان اور اسلوب نگارش کو پسند کیا۔

مولانا غلام رسول مہر کے مطابق مولانا (آزاد) نے لکھا ہے۔

''میری اردو مطبوعات میں ''ترجمان القرآن'' پہلی کتاب ہے جسے لوگوں نے اس ذوق اور عشق کے ساتھ خریدا ہوا اور پڑھا ہو'' (۵)

بلکہ یہ بھی لکھا ہے:

کوئی وجہ نہیں کہ ''ترجمان القرآن'' کافی مقبول عام وخاص نہ ہوا ہو اور ہر پڑھے لکھے نے اس کو پسند نہ کیا ہو اور اس کو دیکھنے اور پڑھنے کی خواہش نہ کی ہو اور جیسے ہو سکا حاصل کر کے نہ پڑھا، مگر کچھ عرصہ کے بعد ہندوستان میں سیاسی سرگرمیاں تیز ہو گئیں۔ جب اس کی دوسری جلد بھی شائع ہو چکی تھی، پہلی جلد تو سورہ بقرہ سے لے کر سورہ انعام تک پر مشتمل تھی اور دوسری جلد سورہ اعراف سے لے کر المؤمنون تک تھی، ترجمہ بھی تشریحی نوٹ بھی پہلی جلد ۱۹۳۰ء میں شائع ہوئی تھی۔

اس کے ساتھ یہ بھی ضروری سمجھا کہ اس کے ساتھ مختصر تشریحی نوٹ ہوں تا کہ پڑھنے والے کو اگر کہیں کسی مسئلہ میں کوئی اشکال پیش آئے تو وہ اس کی مدد سے اپنا اشکال حل کر کے یا جو مفہوم اس کے ذہن میں آئے اس نوٹ سے مقابلہ کر کے دیکھ لے اس نے جو سمجھا ہے وہ صحیح ہے یا نہیں۔

بعض جدید تعلیم یافتہ لوگوں میں اس وقت کی فکری لادینیت بھی آنے لگی تھی اور ہر مسئلہ میں اپنی پسند کی تاویل کر کے خوش ہونے لگے تھے کہ وہ ایک اہم خدمت انجام دے رہے تھے جو ان کی سراسر غلط فہمی تھی اور اس کے باوجود وہ اپنے غلط افکار کی اشاعت پر مصر تھے مولانا آزاد نے خود لکھا ہے:

''کام کی نوعیت کا اندازہ اس طرح کیا جا سکتا ہے کہ قرآن کے جس قدر اردو فارسی ترجمے موجود ہیں سب سامنے رکھ لیے جائیں۔ نیز قدیم تفسیر سے بھی چند مقبول ومستند تفسیریں اٹھالی جائیں۔ پھر کم از کم ایک سورہ کا ترجمہ ''ترجمان القرآن'' میں نکال کر ایک ایک آیت کے ترجمے اور شرح کا ان سب سے مقابلہ کیا جائے اور پوری دقیقہ سنجی کے ساتھ دیکھا جائے کہ کون سی بات وہاں کس شکل اور

نوعیت میں آئی ہے اور یہاں اس نے کونسی نوعیت اختیار کر لی ہے۔(۶)

مولانا نے اس اعتماد ویقین کے ساتھ اپنا ترجمہ اور تشریحی نوٹ لکھا ہے، مولانا اسے محسوس کرتے تھے کہ عوام اتنی محنت نہیں کر پائیں گے اور نہ اہل علم اس ذوق کے متحمل ہوں گے، پڑھتے ہوئے چلے جائیں گے۔ بہت کم علماء اور اہل علم ایسے ہوں گے جن کی نظر وسیع ہوگی اور ترجمہ تفسیر سے دلچسپی رکھتے ہوں گے، چنانچہ یہ لکھا:

''بہر حال زمانہ اس کا اندازہ شناس ہو یا نہ ہو، مگر مؤلف نے زمانہ کی حالت کا پوری طرح اندازہ کر لیا ہے اور اول دن سے اس پر قانع ہے جو کچھ طلب ہے وہ استفادہ وعمل کی ہے اعتراف وتحسین کی نہیں۔(۷)

مصنف اپنی محنت وکاوش جس حد تک کر سکتا ہے وہ اسی کا مکلف ہے۔ باقی کلمات مدح وتحسین اس سے عام طور پر مؤلفین بے نیاز ہی ہوتے ہیں۔ مصنف کا کام تمام ضروری چیزوں کو سامنے فراہم کر کے رکھ دینا ہے۔ عمل کرنا اور فائدہ اٹھانا، پڑھنے والوں اور اہل دل کا کام ہے تاریخ بتاتی ہے کہ وہ حضرات اہل علم جو واقعی قرآن پاک کا ذوق رکھتے ہیں، مولانا آزاد کی تفسیر وترجمہ سے بہت زیادہ خوش ہوئے، ان کے لیے دعائیں کیں اور دوسرے مسلمانوں کو اس کے پڑھنے پر متوجہ کیا۔ چنانچہ لوگوں نے بہت ذوق وشوق سے اسے خریدا بھی اور پڑھا بھی۔

جہاں تحسین ہو وہاں تنقید کا دروازہ بند نہیں کیا جا سکتا کچھ لوگوں نے تنقید برائے تنقید کا مذہب اپناتے ہوئے مولانا کے خلاف دشنام طرازی کی ہے، تاہم مولانا اخلاق حسین قاسمی نے اپنی کتاب ''مولانا آزاد کی قرآنی بصیرت'' لکھ کر ہر ایک حاسدانہ مخالفت کا تذکرہ کیا ہے اور پھر ''ترجمان القرآن'' کی عبارت نقل کر کے اس کی تردید فرمائی ہے۔ یہ حصہ اسی کتاب میں پڑھنے کے لائق ہے، اہل علم کو اگر واقعی غلط پروپیگنڈے سے کوئی تشویش پیدا ہوگئی ہو تو ان کو ''قرآنی بصیرت'' کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ مثلا ایک گمراہ کن پروپیگنڈا یہ تھا ''مولانا عقیدۂ توحید کو کافی سمجھتے تھے، اسی وجہ سے نبوت ورسالت کی بحث نہیں کی، حالانکہ '' ایاک نعبد ''کی تشریح میں مولانا کی یہ سطریں موجود ہیں۔ لکھتے ہیں:

''اسلام نے اپنی تعلیم کا بنیادی حکم جو قرار دیا ہے وہ سب کو معلوم ہے۔'' أشهد أن الـه الا الله وأشهد أن محمد ا عبده ورسوله'' اس اقرار میں جس طرح خدا کی توحید کا اعتراف کیا گیا

ہے، ٹھیک اسی طرح پیغمبر اسلام کی بندگی اور درجہ رسالت کا بھی اعتراف ہے۔ غور کرنا چاہیے کہ ایسا کیوں کیا گیا..... صرف اس لیے کہ پیغمبر اسلام ﷺ کی بندگی اور درجہ رسالت کا اعتقاد اسلام کی اصل واساس بن جائے۔ کوئی شخص دائرہ اسلام میں داخل ہی نہیں ہوسکتا جب تک کہ وہ خدا کی توحید کے ساتھ پیغمبر اسلام کی بندگی اور رسالت کا بھی اقرار نہ کرے۔ (۸)

آزاد کے ترجمہ قرآن کی فنی حیثیت

آزاد شناسوں نے ''ترجمان القرآن'' کے سلسلے میں اس سوال پر بحث کی ہے کہ آیا یہ محض قرآن کا ترجمہ ہے یا اسے تفسیر کہا جاسکتا ہے۔

مولانا غلام رسول مہر نے اسے ترجمہ وتفسیر کے مابین کی ایک درمیانی شے قرار دیا ہے۔ (۹)

ڈاکٹر ملک زادہ منظور اسے مفصل ترجمہ اور مجمل تفسیر تسلیم کرتے ہیں (۱۰)۔ مولانا آزاد نے اس سلسلے میں لکھا ہے:

''ترجمان القرآن'' کا مطالعہ کرتے ہوئے یہ بات پیش نظر رکھنی چاہیے کہ اس کی تمام خصوصیات کا اصلی محل اس کا ترجمہ اور ترجمے کا اسلوب ہے۔ اگر اس پر نظر رہے گی تو پوری کتاب نظر رہے گی۔ اور یہی خزینہ ہے جس میں کتاب کی تمام خصوصیات مدفون ہیں..... جس قدر غور وتدبر سے ترجمے کا مطالعہ کیا جائے گا، اسی قدر قرآن حکیم کے حقائق اپنی اصلی طلعت وزیبائی میں بے نقاب ہوتے جائیں گے۔ ترجمہ کے بعد کتاب کا دوسرا محل تدبر والے نوٹ ہیں..... ان کی ہر سطر تفسیر کے ایک پورے صفحے، بلکہ بعض حالتوں میں ایک پورے مقالے کی قائم مقام ہے۔ اکثر مقامات میں ایسا ہوا ہے کہ معارف ومباحث کا ایک پورا دفتر دماغ میں پھیل رہا تھا، مگر نوک قلم پر پہنچا تو ایک سطر یا ایک جملہ بن کر رہ گیا.....'' (۱۱)

''ترجمان القرآن'' کے متعلق آزاد نے دبے الفاظ میں انکساری کا جو دعوی کیا ہے، اس سے قرآنیات میں اس کتاب کا مقام متعین کرنے میں مدد ملتی ہے۔ آزاد کا بیان ہے:

''کام کی علمی نوعیت کا انداہ اس طرح کیا جاسکتا تھا کہ قرآن کے جس قدر اردو فارسی ترجمے موجود ہیں سب سامنے رکھ لیے جائیں، نیز قدیم تفاسیر میں سے چند مقبول ومستند تفسیریں اٹھالی جائیں۔

یا کم از ''تفسیر کبیر'' ہی منتخب کر لی جائے کہ تفسیری مباحث میں متاخرین کا منتہائے نظر نظر و کاوش وہی ہے۔ پھر کم از کم کسی ایک سورۃ کا ترجمہ ''ترجمان القرآن'' میں سے نکال کر ایک ایک آیت ساتھ دیکھا جائے کہ کون سی بات وہاں کس شکل و نوعیت میں آئی ہے اور یہاں اس نے کون سی شکل و نوعیت اختیار کر لی ہے اور پھر اس اختلاف نظر نے مقاصد و مطالب قرآن کا معاملہ کہاں سے کہاں پہنچا دیا ہے، لیکن ظاہر ہے کہ ایسے اہل نظر کہاں سے آئیں اور اگر کوئی ہو بھی تو اتنی زحمت کیوں برداشت کرنے لگا۔ بہر حال زمانہ اس کام کا اندازہ شناس ہو یا نہ ہو، مگر مؤلف نے زمانے کی حالت کا پوری طرح اندازہ کر لیا ہے اور اول دن سے اس پر قانع ہے، جو کچھ طلب ہے استفادہ و عمل کی ہے، اعتراف و تحسین کی نہیں'' (۱۲)

''ترجمان القرآن'' سے قبل قرآن مجید کے متعدد اردو تراجم موجود تھے۔ (۱۳)

''قرآن کریم کے آٹھویں پارے کے دوسرے رکوع کی ابتدائی تین آیات (سورہ الانعام آیات نمبر ۱۳۰ تا ۱۳۲) کے ترجمے کا تقابلی موازنہ کرنے پر یہ حقیقت بخوبی بے نقاب ہوگئی کہ مولانا آزاد کا ترجمہ دوسرے تراجم کے مقابلے میں سب سے زیادہ بہتر واضح اور مؤثر ہے۔ (۱۴)

مولانا سید اختر علی تلہری نے ترجمان القرآن پر ایک مفصل مقالہ لکھ کر کتاب کی علمی قدر و قیمت کا اعتراف کرتے ہوئے مؤلف کی صلاحیتوں کو سراہا ہے۔ (۱۵)

''ترجمان القرآن'' کے دیباچے میں آزاد نے اپنے فہم قرآن کے بنیادی تصور پر بھی گفتگو کی ہے۔ ان کے نزدیک قرآن فہمی اسلامی تاریخ کے ابتدائی دور میں جس اعلیٰ معیار پر تھی اسے بعد کے مفسرین قائم نہ رکھ سکے۔ لہذا قرآن شناسی کے لیے ضروری ہے کہ اس کے معانی و مفاہیم کے قدیم ترین سرچشموں تک رسائی حاصل کریں اور بعد کے مفسرین نے قرآن کے مطالب کے بیان میں لفظی گورکھ دھندوں اور قیاس آرائیاں سے کام لے کر اس کے مفہوم پر جو نقابیں ڈال دی ہیں، ان کو دور کر دیا جائے۔ (۱۶)

اور مولانا آزاد نے ''ترجمان القرآن'' کے تفسیری حاشیوں میں جگہ جگہ ان نقابوں کو دور کر کے حقائق قرآنی کی رونمائی فرمائی ہے۔ اصحاب کہف کے واقعے میں اصل حقائق پر سے مولانا نے جس طرح پردے اٹھائے ہیں یا اسی سورے میں ذوالقرنین کی شخصیت کے تعین میں جو بحث کی ہے اس سے یقیناً قرآن فہمی کے نئے دروازے وا ہوئے ہیں۔ (۱۷)

''ترجمان القرآن'' کے مقدمے میں بہ لحاظ نزول سورہ الحمد کی اولیت کے ثبوت میں جو بحث کی گئی ہے اور اس سلسلے میں جس طریقے اور سلیقے سے روایات کی تطبیق کی گئی ہے وہ بھی آزاد کی قرآن فہمی پر دال ہے۔(۱۸)

اسلوبیاتی محاسن:

''ترجمان القرآن'' کا ترجمہ اور تشریحی نوٹ یہ واقعہ ہے کہ بہت ہی جاندار اور مؤثر ہیں۔ مولانا کے طرز تحریر پر ممتاز اردو دان پروفیسر رشید احمد صدیقی نے بہت اچھا تبصرہ کیا ہے، وہ لکھتے ہیں:

''مولانا نے لکھنے کا انداز، لب ولہجہ اور مواد کلام پاک سے لیا جو ان کے مزاج کے مطابق تھا، مولانا پہلے اور آخری شخص ہیں جنہوں نے براہ راست قرآن کو اپنے اسلوب کا سرچشمہ بنایا۔ وہی انداز بیان اور زور کلام اور وعید وتہدید، کے تازیانے، جن کے بارے میں کہا گیا ہے کہ پہاڑوں پر رعشہ سیماب طاری کر دیتا ہے۔ مولانا کی تحریروں میں وہ نرمی اور نوازش نہ ملے گی جو پیغمبروں کی دعوت میں ملتی ہے جیسا کہ عرض کر چکا ہوں۔ مولانا کی طبیعت پیغمبروں کی دعوت میں ملتی ہے۔ مولانا کی طبیعت پیغمبری کے رول سے اتنی سازگار نہ تھی جتنی خدائی رول سے، خدا پیغمبروں کی طرح انسانوں میں گھلا ملا نہیں ملتا، اس لیے پیغمبروں کی طرح وہ انسانوں میں سے نہیں ہوتا۔''(۱۹)

مولانا جہاں دنیاوی سیاست سے تعلق رکھتے تھے۔ اس سے کچھ زیادہ اللہ تعالی کی عبادت سے شغف رکھتے تھے، اپنے مسلمان ہونے پر ان کو فخر تھا۔ رام گڑھ میں کانگریس کے اجلاس ۱۹۴۰ء کی صدارت کرتے ہوئے مولانا نے جو خطبہ پڑھا تھا۔ اس میں برملا فرمایا تھا:

میں مسلمان ہوں اور فخر کے ساتھ محسوس کرتا ہوں کہ مسلمان ہوں۔ اسلام کی تیرہ سو سال کی شاندار روایتیں میرے ورثہ میں آئی ہیں۔ میں تیار ہی نہیں کہ اس کا چھوٹے سے چھوٹا حصہ بھی ضائع ہونے دوں۔(۲۰)

مولانا عبدالماجد دریابادی نے لکھا ہے:

''بڑی بات یہ ہے کہ ہندسرکار اور ہندو اہل حکومت سے اتنا گہرا اور ہمہ وقتی تعلق رکھنے کے باوجود اکثریت سے ذرا بھی مرعوب نہیں ہوئے اور کسی موقع پر اپنے کو مسلمان کہتے ہوئے نہ

شرمائے''(۲۱)

ہندوستان جیسے محکوم ملک میں مولانا آزاد شرعی تنظیم قیام امارت کے بڑے حامیوں میں تھے اپنے خطبہ صدارت میں انہوں نے کہا تھا:

''امیر وامارت نہ ہونے کی وجہ سے ایک بڑا مفسدہ یہ رونما ہوا کہ ہندوستان سے قضائے شرعی اور قاضی شریعت کا سلسلہ ختم ہوگیا کیونکہ یہ سلسلہ امارت اور امیر کے قیام پر موقوف ہے''(خطبہ صدارت جمعیۃ علماء، لاہور)

ترجمان القرآن میں زکوۃ کی جہاں بحث آتی ہے، اس میں آپ نے امارت کا مسئلہ ذکر فرمایا ہے لکھتے ہیں:

''تاتاریوں کے غلبہ کے بعد مسلمانوں میں جہاں خیال پیدا ہوا کہ زکوۃ اپنے طور پر مسلمان خرچ کر ڈالے.....مگر ساتھ ہی فقہاء نے اس پر بھی زور دیا ہے کہ جن ملکوں میں اسلامی حکومت قائم نہیں رہی ہے اور اعادہ حالت فورا ممکن نہیں، وہاں مسلمانوں کے لیے ضروری ہے کہ کسی اہل مسلمان کو امیر مقرر کرلیں، تاکہ اسلامی زندگی کا نظام قائم رہے، معدوم نہ ہو جائے۔ اگر اسلامی حکومت کے فقدان سے جمعہ ترک نہیں کر دیا گیا جس کا قیام امام وسلطان کی موجودگی پر موقوف تھا تو زکوۃ کا نظام کیوں ترک کر دیا جائے۔ کس نے مسلمانوں کے ہاتھ اس سے باندھ دیئے تھے کہ اسلامی معاملات کے لیے ایک امیر منتخب کرلیں۔ یا ایک مرکزی بیت المال پر متفق ہو جائیں.....اسلام نے اجتماعی زندگی کا پورا نقشہ بنایا تھا، جہاں اس کے چند خانے بگڑے سمجھ لو پورا نقشہ بگڑ گیا''۔

عرض یہ کرنا ہے کہ مولانا خود بھی مسلمان تھے اور ملت اسلامیہ کا درد رکھتے تھے اور اسلامی نظام کو کسی حال میں فراموش کرنا پسند نہیں کرتے تھے۔ کوئی شبہ نہیں کہ مولانا آزاد قرآن کا ترجمہ اور تشریحی نوٹ لکھ کر مسلمانوں میں زندگی لانے کے لیے کوشاں تھے اور انہیں خواب غفلت سے چونکانا چاہتے تھے اور یہ طے ہے کہ مسلمانوں کی ہی بیداری اور راست روی سے سارے جہاں کے انسانوں میں بیداری اور راست روی قدرۃ آتی ہے جب تک یہ امت راہ راست پر نہیں آتی دنیا کا نظام درست نہیں ہوسکتا۔ اس کے پاس اللہ تعالی کی آخری کتاب ہے اور وہ بالکل محفوظ ہے۔

ڈاکٹر ملک زادہ منظور احمد اس سلسلے میں رقم طراز ہیں:

قرآن کا یہی اسلوب تخاطب جو تعقل اور وجدان کی حسین آمیزش سے قارئین کے دل و دماغ کو مسخر کرتا ہے۔ مولانا کے ترجموں اور تفسیری حاشیوں میں بھی کارفرما نظر آتا ہے۔ یہ انداز بیان مولانا کے رگ وریشہ میں اس حد تک سرایت کر گیا تھا کہ ان کے قلم سے نکلا ہوا ہر جملہ قرآنی طرز بیان کا عکس لیے ہوئے ہوتا ہے۔ وہ پہلے ہمارے وجدان کو متاثر کرتے ہیں اور

پھر ہمارے دروازے سے داخل ہو کر ہمارے دماغ تک پہنچ جاتے ہیں اور اس کو منور کر دیتے ہیں.....(۲۲)

''ترجمان القرآن'' مولانا آزاد کی نثر کے اسلوبیاتی مطالعے میں بھی ایک نئی منزل کی نشان دہی کی تھی۔ اس کتاب میں آزاد نے اس سادہ و پراثر اسلوب نگارش سے کام لیا ہے، جو آیات قرآنی سے سادگی میں ہم آہنگ محسوس ہوتا ہے۔ مولانا کی ابتدائی تحریروں میں کہیں کہیں سہل نگاری کا رجحان مل ضرور جاتا ہے، مگر یہ قدرے دبا دبا رہتا ہے۔(۲۳)

''الہلال''، ''البلاغ'' اور ''تذکرے'' میں آزاد نے جس اسلوب کو برتا وہ سہل نگاری سے زیادہ ادبی مرصع کاری، جوش وخروش اور الفاظ کی گھن گرج کے رجحان سے معمور ہے۔ اسلوب آزاد میں سہل نگاری کا رجحان ''ترجمان القرآن'' میں پہلی بار بھرپور طور پر نمودار ہوتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ظاہر ہوتی ہے کہ آزاد قرآن فہمی کو عام بنانے کے لیے زیادہ سے زیادہ صاف، سلیس اور سہل اسلوب برقرار رکھنا چاہتے تھے۔ بعد کو اسلوب کی سلاست نے ''غبار خاطر'' کے اوراق کو بھی حسن عطا کیا۔

مولانا آزاد نے قرآن مجید کے مطالعے میں اس درجہ انہماک سے کام لیا کہ ان کی تحریروں اور تقریروں کے مواد اور اسلوب دونوں ہی قرآنی اسلوب سے متاثر ہو گئے۔ مواد و اسلوب میں اتحاد و اشتراک کا یہ حسین سنجوگ مولانا کی تقریروں اور تحریروں کو جس جلال و جمال سے معمور کرتا ہے وہ ابوالکلام کو ایسے منفرد اسلوب کا مالک بنا دیتا ہے جو صرف انہیں کا حصہ بن گیا۔ ابوالکلام کی نثر میں قرآنی لب ولہجہ کی کیفیت کو محسوس کرتے ہوئے سجاد انصاری نے لکھا تھا: ''میرا عقیدہ ہے کہ اگر قرآن نازل نہ ہو چکا ہوتا تو.....مولانا ابوالکلام کی نثر اس کے لیے منتخب کی جاتی''۔(۲۴)

''ترجمان القرآن'' آزاد کے ادبی سفر کی درمیانی منزل کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس کی پہلی

جلد ''ترجمان القرآن'' کے عنوان سے دفتر ترجمان القرآن دہلی سے پہلی بار ۱۹۳۱ء میں شائع ہوئی تھی۔(۲۵)

غبار خاطر جو ترجمان کے بہت بعد پہلی بار مئی ۱۹۴۶ء میں چھپی تھی آزاد کی آخری اہم اردو کتاب مانی جاتی ہے۔''غبار خاطر'' میں کئی مقامات پر ''ترجمان القرآن'' کی عبارات ونکات کے نقوش صاف صاف نظر آتے ہیں۔اس سے واضح ہوتا ہے کہ ترجمان نے آزاد کی بعد والی کتاب ''غبار خاطر'' کو بھی متاثر کیا ہے۔اس سلسلے میں صرف ایک مثال پیش ہے ''ترجمان القرآن'' کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

''جس دنیا میں سورج ہر روز چمکتا ہو، جس دنیا میں صبح ہر روز مسکراتی اور شام ہر روز پردۂ شب میں چھپ جاتی ہو، جس کی راتیں آسمان کی قندیلوں سے مزین اور جس کی چاندنی حسن افروزیوں سے جہاں تاب رہتی ہو، جس کی بہار سبزۂ وگل سے لدی ہوئی اور جس کی فصلیں لہلہاتے ہوئے کھیتوں سے گراں بار ہوں، جس دنیا میں روشنی اپنی چمک، رنگ، اپنی بوقلمونی، خوشبو، اپنی عطر بیزی اور موسیقی، اپنا نغمہ وآہنگ رکھتی ہو۔کیا اس دنیا کا کوئی باشندہ آسائش حیات سے محروم اور نعمت معیشت سے محروم ہوسکتا ہے''(۲۶)

''ترجمان القرآن'' کی اس خوش بیانی کی گونج ''غبار خاطر'' کی درج ذیل عبارت میں واضح طور پر محسوس کی جاسکتی:

''جس قید خانے میں صبح ہر روز مسکراتی ہو، جہاں شام ہر روز پردۂ شب میں چھپ ہو، جس کی راتیں کبھی ستاروں کی قندیلوں سے جگمگانے لگتی ہوں، کبھی چاندنی کی حسن افروزیوں سے جہاں تاب رہتی ہوں، جہاں دوپہر ہر روز چمکے، شفق ہر روز نکھرے، پرند ہر صبح وشام چہکیں، اس قید خانہ ہونے پر بھی عیش و عشرت کے سامانوں سے خالی کیوں سمجھ لیا جائے؟''(۲۷)

مولانا ترجمان القرآن کا خاتمہ بھی تحریر کرنا چاہتے تھے، اپنے الفاظ میں فرماتے ہیں:

''ترجمان القرآن کے خاتمہ میں قرآن کے فارسی، اردو اور یورپ کے تراجم پر تبصرہ کیا گیا ہے، اس سے اندازہ کیا جاسکے گا کہ اس مرحلے کی مشکلات کیا کیا تھی، اور وہ کیا اسباب ہیں جن کی وجہ سے آج تک قرآن کے تراجم میں وضاحت اور دل نشینی پیدا نہ ہوسکی''(۲۸)

ہم مولانا آزاد کے امتیازی اسلوب کی طرف اشارہ کرنا ضروری سمجھتے ہیں:

ترجمہ قرآن کے تین طریقے ہیں.

۱۔ پہلا طریقہ ٹھیٹ ترجمہ کا ہے، جس کی نوبت درسی ضرورت کے تحت آتی ہے، اردو میں اس کا مکمل نمونہ شاہ رفیع الدین دہلویؒ کا ترجمہ قرآن ہے۔

۲۔ دوسرا طریقہ بول چال کی ٹکسالی زبان میں ربط مضمون کا خیال رکھ کر ترجمہ کا ہے، اس کا قدیم معتبر نمونہ شاہ عبدالقادر دہلویؒ کا ترجمہ موضح القران ہے، اس قید کے ساتھ کہ شاہ صاحب کے دور میں عام فہم اور بامحاورہ زبان کا جو روپ تھا، اس کو آئندہ کئی منزلوں سے گزر کر نکھرنا اور درجۂ کمال تک پہنچنا تھا۔

۳۔ تیسرا طریقہ اردو زبان کے خدوخال کا پوری طرح نمایاں ہونے کے بعد کا ہے کہ بامحاورہ ورائج زبان میں معنی خیز ومطلب آمیز ترجمہ کیا جائے، یہ بنیادی طور پر دوسرے طریقہ کا ترقی یافتہ نمونہ ہے، اس اضافی امتیاز کے ساتھ کہ اس میں مطلب آموز حصہ ربط مضمون کی ظاہری سطح سے نیچے اتر کر زیادہ گہرائیاں لیے ہوتا ہے۔ ڈپٹی نذیر احمد کا ترجمہ اس کا پہلا عملی نمونہ ہے، اس میں قوسین کا استعمال ہوتا اور جابجا حاشیوں کی ضرورت بھی پڑتی ہے، اسے خواہ آزاد ترجمہ کہیے یا آزاد ترجمانی۔

آزاد ترجمہ کی ایک سے زیادہ قسمیں مترجم کی وسعت نظر وتعمق فکر کے لحاظ سے ہوسکتی ہیں، لیکن ان میں اصل فرق، متن سے ترجمہ کی نزدیکی یا دوری کے اعتبار سے پیدا ہوتا ہے، اس کا اندازہ ایک ہی نص قرآنی کے درج ذیل تراجم سے لگایا جاسکتا ہے:

عربی زبان کے معیار کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ دنیا کے دور دراز گوشوں میں آغاز اسلام سے اب تک یکساں بلند رہا، جس کا سب سے بڑا سبب قرآن پاک کی غیر متبدل زبان وبیان اور اس کے معانی ومطالب کا عالمگیر اثر ونفوذ ہے۔ ان قوموں سے قطع نظر، جن کی مادری زبان عربی، بے شمار ایسی اقوام ہیں جن کی مادری زبان کچھ اور ہے، لیکن کلام پاک کی تلاوت وترتیل اور اوراد ووظائف کے التزام، مذہبی فرائض بجالانے اور شعوری یا غیر شعوری طور پر روزانہ زندگی میں عربی فقروں کے زبان زد ہوتے رہنے سے عربی ان کی زندگی میں دخیل اور ان کے ذہنوں میں پیوست ہوگئی ہے۔ ان کے علاوہ مسلمانوں کے چھوٹے بڑے بے شمار عربی مدارس ہیں جہاں قدیم زمانے سے آج تک اس کی مکمل تعلیم

دی جاتی ہے۔اب سے پہلے مسلمانوں کی علمی، تصنیفی اور ادبی زبان بھی عربی تھی۔ایک حد تک فارسی کو بھی یہی درجہ حاصل ہے۔

یہاں عربی و فارسی زبان کی خوبیوں پر تفصیل سے گفتگو کرنا مقصود نہیں۔ بتانا صرف اتنا ہے کہ عربی میں کلام پاک کا ہونا عربی زبان کی شہرت اور بقا کی ایسی ضمانت ہے، جس کو زوال نہیں اور اس زبان کا صحیح عمل دخل جہاں کہیں جس زبان اور قوم میں ملے گا ان میں حسب استعداد عربی زبان اور عرب قوم کی زبان اور توانائی بھی ملے گی۔

مولانا آزاد کا یہ کام دوسرے علمی ادبی کاموں میں دینی خدمات کے لحاظ سے افضلیت رکھتا ہے اگر چہ حالات نے اس کام کو مکمل نہیں ہونے دیا لیکن بلا شبہ اس کی دینی، علمی اور ادبی حیثیت برابر رہے گی۔

اس میں مولانا آزاد نے بعض ایسے موضوعات پر قلم اٹھایا ہے جن سے عام مفسرین سرسری گزرے ہیں، مولانا نے انہیں وضاحت سے دلائل کے ساتھ دلنشین انداز میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے جس سے ان کے مطالعے کی وسعت اور دقت نظر کا ثبوت ملتا ہے۔

جہاں تک ترجمہ کا تعلق ہے چونکہ مولانا عربی، فارسی میں بڑی اچھی صلاحیت کے مالک تھے، اسی لئے وہ اس کام سے نہایت خوش اسلوبی سے عہدہ برآ ہوئے ہیں، انہوں نے ترجمہ کو محض لفظی ترجمہ نہیں رہنے دیا ہے اس میں وہ انداز اختیار کیا ہے کہ قاری کو مطالب تک پہنچنے میں آسانی ہوتی ہے اسلوب عالمانہ، زبان شستہ اور عام فہم لیکن پروقار استعمال کی گئی ہے۔ملاحظہ ہو۔وہ تفسیر سورۂ فاتحہ میں سورت کی اہمیت اور خصوصیت بتاتے ہوئے لکھتے ہیں:

''یہ قرآن کی سب سے پہلی سورت ہے اس لئے ''فاتحۃ الکتاب'' کے نام سے پکاری جاتی ہے۔جو بات زیادہ اہم ہوتی ہے قدرتی طور پر پہلی اور نمایاں جگہ پاتی ہے، یہ سورت قرآن کی تمام سورتوں میں خاص اہمیت رکھتی تھی، اس لئے قدرتی طور پر اس کی موزوں جگہ قرآن کے پہلے صفحہ ہی میں قرار پائی''(۲۹)

مولانا سعید اکبر آبادی کا یہ کہنا بجا ہے:

''مولانا ابوالکلام آزاد نے اردو ادب کے چمن میں حسن انشاو بیان کے جو پھول کھلائے

ہیں یوں تو سب ہی سدا بہار ہیں لیکن مستقل تصنیف کی حیثیت سے قرآن مجید کی تفسیر ''ترجمان القرآن'' مولانا کی تمام علمی اور ادبی تحریروں میں شاہکار کی حیثیت رکھتی ہے، قلم کی توانائی ،اجتہاد فکر ،وسعت نظر ومطالعہ اور جذبہ تحقیق وتدقیق مولانا کی یہ وہ خصوصیات ہیں جو ان کی ہر علمی وادبی تحریر میں نظر آتی ہیں لیکن مولانا کی یہ خصوصیات اس کتاب میں جا بجا نمایاں ہیں''(۳۰)

حواشی

(۱) رفع الغواشی عن التراجم والحواشی، ص:۵۔

(۲) البیان القرآن، کلکتہ ۱۳۴۶ھ، ص:۱۲

(۳) القرآن

(۴) ترجمان القرآن، الفاتحہ، ص ۷۶۔

(۵) نقش آزاد، ص:۳۴

(۶) ترجمان۔۲، ص:۴۰۔

(۷) ایضا۔

(۸) مولانا آزاد کی قرآنی بصیرت (اخلاق حسین قاسمی)، ص:۱۱۹۔

(۹) ''باقیات ترجمان القرآن''، غلام رسول مہر، ص:۵۱، بحوالہ مقالہ ڈاکٹر ملک زادہ، ص:۳۶۳،۳۶۳۔

(۱۰) ترجمان، دیباچہ

(۱۱) ایضا، دیباچہ

(۱۲) ایضا، دیباچہ

(۱۳) آزاد فکر وفن، ص:۳۲۷ تا ۳۴۹ برائے تفصیلات۔

(۱۴) آزاد کے ترجمے کے لیے دیکھئے ''ترجمان القرآن'' جلد دوم ساہتیہ اکادیمی نئی دہلی، طبع ۱۹۷۶ء ص:۷۸ تا ۸۹ تقابلی موازنے کے لیے دیکھیے آزاد، فکر وفن، ص:۳۷۷ تا ۳۸۳۔

(۱۵) انوار ابوالکلام: مرتبہ علی جواد تریدی، نامی پریس لکھنؤ، طبع ۱۹۵۹ء، ص:۱۲۲ تا ۱۶۲۔

(۱۶) ''ترجمان القرآن، دیباچہ، ص:۳۱ تا ۴۶۔

(۱۷) ''ترجمان القرآن'' جلد دوم ساہتیہ اکادیمی نئی دہلی، طبع ۱۹۷۷ء ص:۴۰۵ تا ۵۴۲۔

(۱۸) ترجمان ا، مقدمہ۔ص: ۷۰تا۸۴

(۱۹) علی گڑھ میگزین ۱۹۵۹ء

(۲۰) خطبات آزاد ساہتیہ اکیڈمی، دہلی، انڈیا۔

(۲۱) ابوالکلام آزاد معاصرین کی نظر میں

(۲۲) آزاد فکر وفن، ص: ۳۷۵۔

(۲۳) ایضا، ص: ۱۰۷تا۱۰۸۔

(۲۴) محشر خیال: سجاد انصاری (بہ حوالہ آزاد فکر وفن، ص: ۲۲۳)

(۲۵) دیکھیے۔

(۲۶) ترجمان القرآن جلد اول، مؤلفہ ابوالکلام احمد دفتر ترجمان قرآن دہلی، فل اسکیپ سائز کے ۷۶۔ ۴۵۵۔۵۳۱ صفحات پر مشتمل یہ کتاب کا پہلا ایڈیشن کتب خانہ ندوہ لکھنؤ میں موجود ہے۔

(۲۷) میرا عقیدہ، ص: ۷، میں مولانا غلام رسول مہر کے بیان سے پتہ چلتا ہے کہ ترجمان کی پہلی جلد کی اشاعت اول ۱۹۳۱ء میں ہوئی تھی۔

(۲۸) ''ترجمان: ا، ص: ۱۱۱تا۱۱۲۔

(۲۹) غبار خاطر، ص: ۶۹۔

(۳۰) ترجمان القرآن، ص: ۱/۷۲۔